Fikr-o-Nasar (Islamabad) 44:3 (2007)

فکر و نظر............ اسلام آباد　　　جلد: ۴۴　　　شمارہ: ۳

مقاصد شریعت کے فہم و تطبیق میں اختلاف کا حل☆

محمد نجات اللہ صدیقی☆☆

اختلاف ہماری انفرادیت اور آزادی کا ایک لازمی پہلو ہے۔ اختلاف چیزوں کو سمجھنے میں بھی ہوتا ہے اور ان کو برتنے میں بھی۔ نئے پیش آمدہ مسائل کو سمجھنے، ان سے متعلّق مقاصد شریعت کی تعیین اور کسی مخصوص صورت حال میں ایسے فیصلہ (حکم) تک پہنچنے میں اختلاف ایک قدرتی بات ہے جس کے ذریعہ مقاصد شریعت کی تکمیل و تحصیل مطلوب ہو۔ اس مقالہ میں اس بات پر غور کیا جائے گا کہ ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ اسلام نے ہمیں اختلاف کی صورت میں فیصلہ کرنے کا کیا طریقہ بتایا ہے۔

اس سے پہلے ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مقاصد شریعت کی پہچان اور تطبیق میں عقل و فطرت کلیدی رول ادا کرتی ہے(۱)۔ آج کی گفتگو کا آغاز ہم اس صورت حال کے تجزیے سے کریں گے جو غوروفکر کا سبب بنا۔ یہ بتانے کے بعد کہ یہ تجزیہ ایک عقلی کام ہے اس بات پر غور کیا جائے گا کہ اس صورت حال سے متعلّق مقاصد شریعت کو پہچاننے میں اختلاف کیوں وارد ہے۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے۔ اس کے بعد ہم باہم مشورے سے کسی فیصلہ تک پہنچنے کے اس طریقے پر غور کریں گے جو اسلام نے سکھایا ہے۔ اس سیاق میں یہ دیکھا جائے گا کہ شورائی طریق فیصلہ کے کیا تقاضے ہیں اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ آخر میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ معاصر مسلم معاشرہ نے اس سلسلہ میں اب تک کتنی پیش رفت کر لی ہے۔

DMHL

☆ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب کے تین مقالات فکر و نظر کے درج ذیل شماروں میں طبع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

۱۔ مقاصد شریعہ، ایک عصری مطالعہ۔ اپریل، جون ۲۰۰۴ء

۲۔ مقاصد شریعہ اور معاصر اسلامی فکر-وقائع اور امکانات۔ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۵ء

۳۔ مقاصد شریعہ کی پہچان اور تطبیق میں عقل و فطرت کا حصہ۔ جنوری، مارچ ۲۰۰۶ء

☆☆ وزیٹنگ پروفیسر، اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، اسلامی ترقیاتی بینک، جدہ-سعودی عرب۔

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.　　http://iri.iiu.edu.pk/

یہ طے کرنا بڑا مشکل کام ہے کہ اختلاف ہوتا کیوں ہے۔ پھر بھی اس امر پر غور کرنے سے فائدہ ہو گا اور اختلافات سے نبٹنے میں مدد ملے گی۔ ہمارے لیے تین طرح کے اختلافات زیادہ قابل توجّہ ہیں: پیش آمدہ صورت حال کو سمجھنے میں اختلاف، اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو سمجھنے میں اختلاف اور اس بات میں اختلاف کہ کیا فیصلہ کیا جائے۔

حالات کے تجزیے میں اختلاف

اپنے ماحول کو ہم اپنے حواس کی مدد سے جانتے ہیں۔ مگر کسی چیز کو سمجھنے کے لیے محض اسے جان لینا کافی نہیں۔ عقل کو بہت کچھ اور کرنا پڑتا ہے۔ حافظہ، تجربہ اور تخیّل (imagination) کے علاوہ علوم پر دسترس کی بھی اس عمل میں بڑی اہمیت ہے۔ افراد انسانی چوں کہ ان تمام باتوں میں ایک دوسرے سے کم و بیش مختلف ہوتے ہیں، اس لیے قدرتی طور پر اپنے ماحول کے تجزیے میں ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف اس صورت میں اور زیادہ ہوتا ہے جب ایسے پیچیدہ مظاہر سے واسطہ ہو جیسے ماحولیاتی تلوّث global warming، افراط زر، اقتصادی پس ماندگی، وغیرہ۔ اس اختلاف کو رفع کرنا یا اس میں کمی کی کوشش اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ صورت حال کو سمجھنے میں جتنا اتّفاق ہو گا اجتماعی طور پر کسی فیصلہ تک پہنچنے اور اس پر عمل درآمد میں اتنی ہی آسانی ہوگی۔ اختلاف میں کمی کی پہلی شرط باہم تبادلۂ خیالات ہے۔ اجتماعی سطح پر ریسرچ کا اہتمام اور مسئلہ زیرغور سے متعلّق جو معلومات میسّر ہوں ان کی عام اشاعت بھی ضروری ہے۔ مگر ان سب باتوں سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس بارے میں وہم و گمان، ظن و تخمین، سنی سنائی باتوں اور خرافات یا mythology پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ جسمانی امراض کا معاملہ ہو یا سماجی الجھنوں کا، کسی تشخیص پر صرف اس لیے اصرار نہ کیا جائے کہ آبا و اجداد سے یہی مانتے چلے آئے ہیں، جب کہ نئی تحقیقات سے پرانی تشخیص غلط ثابت ہو چکی ہو۔

ہدایات الٰہی کو سمجھنے میں اختلاف

اللہ تعالیٰ کی ہدایات جاننے کے لیے ہم قرآن و سنّت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآن پاک کی زبان عربی ہے، وہ ساتویں صدی عیسوی میں نازل ہوا تھا اور اس کا نزول ایک خاص جغرافیائی خطّہ میں بسنے والی قوم پر ہوا تھا۔ آج اکّیسویں صدی میں مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف ملکوں میں رہنے والے لوگوں کے درمیان اس کے سمجھنے میں اختلاف کی جڑیں زیادہ تر انھی تین میں پیوستہ ہیں: زبان، مکان اور زمان۔ جہاں تک ان اختلافات سے عہدہ برآ ہونے کا تعلّق ہے، ان تینوں میں

سب سے آسان وہ ہے جو بادی النظر میں سب سے مشکل معلوم ہوتا ہے، یعنی زبان کا اختلاف۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ علماء نے زبان سے متعلّق علوم، لغت و معانی، نحو و صرف، بلاغت......وغیرہ کو مرتّب کر دیا اور یہ ممکن ہو گیا کہ وہ لوگ بھی عربی زبان میں مہارت حاصل کر لیں جن کی مادری زبان عربی نہ ہو۔ نیز مترجمین کی خدمات کے طفیل دنیا کی بیشتر زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے اور تفاسیر بھی میسّر ہو گئے۔ ان سب کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لسانی، لغوی اور مماثل بنیادوں پر فہم قرآن میں اختلاف کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔

جغرافی طور پر مختلف علاقوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کا احاطہ دشوار ہے۔ درجۂ حرارت، رات دن کی کمی بیشی، بارش کی مقدار اور اس کا زراعت وغیرہ پر اثر...... ان میں سے چند نمایاں چیزیں ہیں۔ مجموعی طور پر ان چیزوں کا اثر لباس، وضع قطع، مکانوں کی ساخت، غذا، اور رہن سہن سے متعلّق دوسرے امور پر پڑتا ہے۔ قرآن کا منشاء سمجھنے میں ان باتوں کا لحاظ ضروری ہے، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے۔ یہاں صرف یہ نوٹ کرنا ہے کہ قرآن فہمی میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے اور رہے گی کہ حکم شرعی کی تعیین، یعنی مسئلہ زیر غور سے متعلق فیصلہ کرنے میں ان باتوں کا کس حد تک لحاظ کیا جائے جن کا تعلّق مکانی فرق سے ہے۔

زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ بڑی بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ان میں بعض تبدیلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو سامنے رکھنا قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے۔ پہلے ہم زمانہ آگے بڑھنے کے ساتھ آنے والی بعض بڑی تبدیلیوں کا ذکر کریں گے۔ انسانی آبادی میں اضافہ، نقل و حمل اور مواصلات کے بہتر اور زیادہ تیز رفتار ذرائع میسّر آنا۔ اشیاء و خدمات کی پیداوار میں توسیع اور اس کے ساتھ ان کے مبادلہ کے ذرائع و وسائل اور طریقوں میں تبدیلی، نیز نئے پیداواری رشتوں اور تنظیم کی نئی شکلوں کا اختیار کیا جانا...... مگر ان تمام تبدیلیوں سے زیادہ اہم وہ نیا علم ہے جو انسان کو اپنے جسم و دماغ، اپنے سماج، اپنے جغرافیائی ماحول، اور بالعموم کائنات کے بارے میں سائنس کی ترقی کے نتیجہ میں حاصل ہوا ہے۔ قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے اور اس کا منشاء پورا کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے، یہ ان باتوں کو سامنے رکھے بغیر نہیں معلوم کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ سارے لوگ ان تبدیلیوں کو نہ یکساں وزن دیتے ہیں نہ ان کو ان کے بارے میں یکساں معلومات ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ قرآن فہمی میں اختلاف کی ایک بڑی وجہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں لوگوں کی بصیرت اور پس منظر (perception and perspective) کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے۔

سنّت قرآن کی شرح ہے۔ رسول کریم ﷺ کے اسوہ کو سامنے رکھے بغیر ہدایتِ الٰہی کا فہم مکمل نہیں ہو سکتا۔ سنّت کے فہم میں بھی (زمان و مکان اور زبان سے متعلّق) وہ تینوں باتیں سامنے رکھنا ہوں گی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مزید برآں سنّت کو سمجھنے میں کچھ اور باتیں بھی سامنے رکھنا ہوں گی۔ سنّت رسولؐ کا بیان جن احادیث میں آیا ہے وہ سند کے اعتبار سے ایک درجہ کی نہیں ہیں اور اس درجہ بندی میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ بات اس کے علاوہ ہے کہ کسی حدیث کا درجہ کتنا ہی بلند ہو وہ قرآن کے درجہ کو نہیں چھوسکتی۔ اسناد میں اختلاف کے ماسوا حدیث کے بارے میں اختلاف کی دوسری بنیادیں بھی ہیں جن کا مطالعہ مناسب مراجع کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مقالہ کے موضوع کے پیش نظر ہمارے لیے مسئلہ پر ایک دوسرے زاویہ سے نگاہ ڈالنا زیادہ مفید ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ کا فہمِ قرآن اور اس فہم کے مطابق عملی اقدامات ہمارے لیے سند ہیں۔ مگر منشاء ہدایت کا یہ فہم اور اس کی یہ تطبیق ایک مخصوص زمان و مکان میں عمل میں آئی اور اس کو اسی سیاق میں دیکھا اور سمجھا جانا چاہیے۔ اس بات کی متعدّد مثالیں موجود ہیں کہ سیاق (context) بدل جانے کی وجہ سے اس سے مختلف فیصلہ کیا گیا جو رسو ل اللہ ﷺ نے کیا تھا(٢)۔ یہاں ان تفصیلات میں جانے کی بجائے صرف یہ نوٹ کرنے کی ضرورت ہے کہ فہم سنّت میں اختلاف کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں جن میں یہ وجہ بھی شامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس سیاق میں فیصلہ کیا تھا اس کے بارے میں لوگ ایک رائے نہ رکھتے ہوں۔ اس کی تاریخی مثالیں آگے سامنے آئیں گی۔

فیصلہ میں اختلاف

ماحول کا تجزیہ اور قرآن و سنّت کی طرف رجوع اس لیے ضروری ہوا کہ ہم یہ طے کر سکیں کہ کرنا کیا ہے۔ کچھ لوگ اس رائے کے بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی نئے فیصلہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ فرض کیجیے اس مرحلہ سے گزر گئے، تو بھی فیصلہ در پیش آ جانے پر اختلاف واقع ہونے کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ فیصلہ کرنے والا کون ہو۔ دوسرا یہ کہ فیصلہ اگر بہت سے لوگوں کو مل کر کرنا ہوا تو سب کی رائے یکساں وزن رکھے گی یا نہیں۔ اس بارے میں بھی اختلاف وارد ہے کہ مجرّد کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے یا اس سے بھاری اکثریّت درکار ہو گی۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ فیصلہ وہی قابل قبول ہے جو مکمّل اتّفاق رائے سے ہو۔ یہ اختلاف بھی موجود ہے کہ جو فیصلہ کیا جائے وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ہے یا کسی ایک ملک یا چند ملکوں کے لیے۔ اس بات کے بارے میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے کہ فیصلہ عارضی یا کسی متعیّن مدّت کے لیے

ہے یا ہمیشہ کے لیے۔ یہ سوال بھی ہو گا کہ فیصلہ ایسا ہے جو متعلّقہ افراد کی مرضی کے علی الرغم ان پر لاگو ہو گا یا انھیں اس کو قبول کرنے یا نہ کرنے کی آزادی ہوگی..... یہ بڑے اہم اختلافات ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ سنگین وہ اختلافات ہیں جو کسی فیصلہ سے متوقّع فوائد یا ان ممکنہ نقصانات کے بارے میں ہوں جن کا اندیشہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر پیش آمدہ نئے مسائل کا تعلّق ایسے امور سے ہوتا ہے جو نہ خالصۃً مفید ہوں نہ سر تا پا مضر، بلکہ جن میں نفع و نقصان دونوں پہلو ہوتے ہیں اور فیصلہ کا مدار دونوں کے درمیان موازنہ پر ہوتا ہے۔ یہ موازنہ بہت مشکل کام ہے۔ فوائد کبھی کسی گروہ کو ہونے والے ہوتے ہیں اور نقصانات کسی دوسرے گروہ کو اور اکثر اوقات ملی جلی صورت حال سے سابقہ پڑتا ہے۔ یعنی نفع عام بھی ہو تو سب کو برابر نہیں ہوتا اور یہی حال نقصان کا بھی ہو سکتا ہے۔ نفع کا تعلّق کبھی ہمارے جسم و جان سے ہوتا ہے کبھی خاندان اور سماج سے۔ کبھی نفع نقصان اقتصادی نوعیت کے ہوتے ہیں کبھی سیاسی نوعیت کے، بلکہ اکثر کئی طرح کے منافع اور کئی طرح کی مضرتیں سامنے ہوتی ہیں ان سب پر مستزاد یہ کہ بعض منافع یا مضرتیں وقتی سمجھی جاتی ہیں اور بعض طویل المیعاد، ایسے میں اختلافات کا ہونا ناگزیر ہے۔

اس فہرست کو مزید طول دیے بغیر اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹیں گے: مقاصد شریعت کے فہم و تطبیق میں بہت سی وجوہ کی بنا پر اختلاف ہوتا ہے، پھر اختلاف کی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ اختلاف کو نہ صرف موجود سمجھا جائے بلکہ اس کے وجود کو برا، قابل مذمّت یا قابل افسوس و ندامت قرار دینے کی بجائے اسے ایک نارمل امر واقعہ سمجھتے ہوئے اس سے عہدہ برآ ہونے کا اہتمام کیا جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اختلاف دور کرنے یا کم سے کم اس کا دائرہ محدود کرنے کو ایک پسندیدہ کام اور مطلوب قرار دیا جائے، کیوں کہ اس سے پیش آمدہ صورت حال میں مقصدِ شریعت کی شناخت اور اس کے عملی تقاضے پورا کرنے میں مدد ملے گی۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ان باتوں کا اہتمام کیا جائے جو رفع اختلاف کے لیے ضروری ہیں، مثلاً تبادلہء خیالات اور اظہار خیال کی آزادی، آزادیِ اجتماع و تنظیم وغیرہ۔ متعلّقہ معلومات کو جمع کرنے اور انہیں پھیلانے کا انتظام بھی درکار ہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ رفع اختلاف کو مطلوب قرار دینے اور اس کے لیے کوشش کرنے کے ساتھ لوگ اس بات پر قانع ہوں کہ اگر ان کے درمیان صورت احوال کے تجزیے، اس کے بارہ میں

ہدایت الٰہی کو سمجھنے اور متعلّقہ مقاصد شریعت کی تعیین میں پورا اتّفاق نہ ہو سکا تو بھی فیصلہ کی شکل نکالی جا سکے گی اور وحدت امّت برقرار رہے گی، نیز یہ کوئی عجوبہ نہ ہو گا، مسلمان پہلے بھی ان جیسے حالات سے گزر چکے ہیں۔

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ زبان، مکان اور زمان کے فرق سے پیدا ہو سکنے والے اختلافات کو کم کرنے اور ان کا دائرہ محدود کرنے اور معاشرہ میں ان کی وجہ سے تشویش اور افسردگی پیدا ہونے کی روک تھام کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

زبان کے فرق کو بنائے اختلاف بننے سے روکنا

اس بات کا اہتمام کرنا ہو گا کہ ہر ملک میں ایسے تعلیمی اور تحقیقی ادارے موجود ہوں جو ایسے عالم تیار کرسکیں جو عربی زبان و ادب پر اعلیٰ درجہ کی قدرت اور مکمّل عبور رکھتے ہوں۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی انتظام کرنا ہو گا کہ اس ملک کی زبان یا زبانوں میں اسلام کی بنیادی کتابیں دستیاب ہوں تاکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی، جو عربی زبان میں دسترس نہ رکھتے ہوں، زیرغور امور پر بحث و مذاکرہ میں حصّہ لینا ممکن ہو۔ ترجموں کی صحت کی جانچ کے علاوہ ان کی وسیع اشاعت بھی ضروری ہے۔ جن اسلامی علوم کی امّہات کتب کا ترجمہ نجی دائرے میں نہ سامنے آ رہا ہو ان کے ترجمہ اور نشر کا اجتماعی سطح پر اہتمام کیا جانا چاہیے۔ اصل ہدف یہ ہے کہ زبان کا فرق حل طلب مسائل پر غور وفکر اور تبادلۂ خیال میں نہ تو مانع بنے نہ اختلافات کا دائرہ وسیع کرے۔

مکانی فرق سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت

اللہ کا آخری ہدایت نامہ عرب میں نازل ہوا جب کہ اس کی پیروی دنیا کے ہر حصّے میں کی جاتی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ایک طرف تو سرزمینِ عرب کا علم ہو اور دوسری طرف ان ملکوں کا جس میں تعمیل احکام و ہدایات مطلوب ہو۔ دنیا کے بارے میں عام معلومات کے ساتھ انسانی جغرافیہ (human geography) کی طرف خصوصی توجّہ درکار ہے۔ پہاڑی علاقوں، میدانی علاقوں، ریگستانی علاقوں اور ساحلی علاقوں میں بسنے والوں کے عادات و اطوار، بود و باش اور عرف میں قدیم سے جو فرق پائے جاتے ہیں ان کا تعلّق بہت سے ایسے مسائل سے ہوسکتا ہے جو ہمارے سامنے آئیں، لہٰذا ان کے بارے میں علم سے اختلاف کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ جگہ سے متعلّق معلومات کا تعلّق قرآن و سنّت کو سمجھنے کے ساتھ تو ہے ہی، فقہ، تفسیر، شرح احادیث اور اسلامی تاریخ کی تدوین چونکہ زیادہ تر جزیرۃ العرب کے باہر، عراق، شام اور مصر وغیرہ میں ہوئی اس لیے ان علاقوں کے بارے

میں جغرافیائی معلومات کی بھی اہمیت ہے۔ کسی بات کے گہرے فہم کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کہاں کہی گئی۔ ان معلومات میں کمی اکثر اس بات کی تعبیر میں اختلاف کا سبب بن جاتی ہے۔ بحث کے اس حصّہ میں ہم ان باتوں کی نشاندہی کر رہے ہیں جو اختلاف آراء کا دائرہ محدود کر سکتی ہیں۔

چوں کہ زیر غور مسئلہ کے بارے میں فیصلہ کا نفاذ دنیا کے کسی بھی علاقہ میں کیا جا سکے گا اس لیے مختلف علاقوں کے ایسے جغرافیائی حالات جو زمانہ کے ساتھ ہونے والی ترقّیات سے متأثر نہ ہوئے ہوں، مثلاً دن رات کی کمی بیشی، ان کے بارے میں معلومات کی زیادہ اہمیت ہے۔

زمانہ بدلنے سے رونما ہونے والے فرق کے بارے میں اختلافات کا مسئلہ

زمانہ کے آگے بڑھنے کے ساتھ جو تبدیلیاں بالفعل واقع ہو چکی ہیں ان کو جاننے اور سمجھنے میں اختلاف کی وجہ صرف نا واقفیّت ہو سکتی ہے ۔بعض امور زندگی کے بارے میں واقفیّت عام کرنا آسان ہے، مثلاً ذرائع نقل و حمل اور مواصلات میں آنے والی تبدیلیاں۔ مگر بعض پیچیدہ امور کا معاملہ اتنا آسان نہیں۔ انسانی نفسیّات، سماجی اداروں، تعلیم و تربیت، مرض و علاج، جرم و سزا......وغیرہ کے بارے میں علوم میں بڑی ترقی ہوئی ہے مگر ان کے بارے میں معلومات عام کرنے میں دو بڑی مشکلیں سامنے آتی ہیں: پہلی مشکل یہ ہے کہ یہ باتیں عام فہم نہیں ہوتیں، ان کو سمجھنے کے لیے کچھ اور جاننا سمجھنا ضروری ہوتا ہے جو سب کو میسر نہیں ہوتا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ مواصلات وغیرہ میں مذکورہ بالا تبدیلیوں کی طرح یہ دوسری تبدیلیاں جو نفسیّات، سماجیّات، اقتصادیات، علم تعلیم و تربیت، علم الامراض، علم الادویہ، اورعلم الجرائم (Criminology) وغیرہ میں آئی ہیں ان کا تعلّق محسوسات سے نہ ہونے کی وجہ سے خود اہل علم و ہنر کے درمیان ان کے بارے میں بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ جو نیا مسئلہ زیر غور آئے اس سے متعلّق تازہ ترین معلومات سامنے رکھیں۔ اگرچہ اس بارے میں ہر ایک کی رائے ایک نہ ہو سکے گی کہ کل اور آج میں کتنا فرق ہے پھر بھی اس بارے میں اختلاف کا دائرہ ضرور محدود ہو جائے گا۔

یہاں یہ بات سامنے رکھنا ضروری ہے کہ کل سے مراد صرف وہ زمانہ نہیں جس میں قرآن نازل ہوا بلکہ حدیث کی جمع و تدوین، فقہ کے مختلف اسکولوں کا ظہور و عروج، اور دیگر اسلامی علوم کے نشوونما کا زمانہ بھی، حسب موقع اور مسئلہِ زیر غور کی مناسبت سے، اہم ہے۔ عمومی طور پر یہ بات سامنے رہے کہ جب بھی کسی عبارت (text) یا امر واقعہ (event) کا حوالہ دیا جائے اس کے زمانہِ بیان یا زمانۂ وقوع کا ذکر آئے اور بتایا جائے کہ اس وقت اور آج میں کو ئی ایسا فرق تو واقع نہیں ہوا جس

کا فیصلہ پر اثر انداز ہونا ناگزیر ہو؟ ظاہر ہے اس سوال کا جواب مختلف شرکاء بحث مختلف دیں گے، اہم بات یہ ہے کہ لوگ اختلاف کی ان وجہوں سے باخبر ہوں، ان کو عقیدہ و مسلک کا اختلاف نہ بننے دیں اور اختلافات کے باوجود تبادلۂ خیالات اور بحث و مذاکرہ کے لیے تیار رہیں۔

میرا خیال ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل پر غور و فکر کے ذریعہ کسی فیصلہ تک پہنچنے کے عمل میں آج ہمیں جن ممکن اختلافات سے واسطہ ہے ان میں اس قسم کے اختلاف کی اہمیت سب سے زیادہ ہے جس کا اس وقت ذکر ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امّت کو جتنی کامیابی زبان اور مکان کے فرق پر مبنی اختلافات سے نبٹنے میں ہوئی ہے اتنی زمانہ کی تبدیلی پر مبنی اختلافات سے نبٹنے میں نہ ہوسکی۔ آئندہ ہم اس بات پر گفتگو کریں گے کہ اس کمی کی تلافی کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، مگر پہلے اس بات پر غور ضروری ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

مسلمانوں کے فکری احوال اور بدلتا ہوا زمانہ

اس سلسلہ میں دو باتیں سب سے نمایاں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ زمانہ آگے بڑھنے کے ساتھ زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کی رفتار یکساں نہیں رہی۔ عہد نبویؐ کے بعد کئی صدیوں تک نقل و حمل اور مواصلات کے ذرائع میں کوئی بڑی ترقی نہیں ہوئی، زراعت و صنعت کا حال بھی یہی رہا۔ طاقت (energy) جب تک صرف انسانوں کی قوّت بازو، حیوانات یا ہوا اور پانی سے حاصل کی جاتی رہی، یہی حال رہا۔ سترہویں صدی عیسوی میں، یعنی عہد نبوّت کے ہزار سال بعد، بھاپ کا انجن دریافت ہونے سے نقل و حمل کی دنیا میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ مگر دو صدی بعد بجلی کی دریافت نے انقلابی اثرات مرتّب کیے اور بیسویں صدی میں پہلے پٹرول کے بڑے پیمانے پر استعمال اور پھر ایٹمی طاقت کی دریافت نے دنیا بدل دی۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی تاریخ کے پہلے ہزار سال اور اس کے آخر کے پانچ سو سالوں میں تبدیلیوں کی رفتار اتنی مختلف رہی کہ کوئی مقابلہ ممکن نہیں۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب تک مسلمان خود مختار رہے ان کا رویّہ فکری اختلافات، اظہار خیالات کی آزادی، اور بحث و مذاکرہ کے بارے میں اس سے مختلف رہا جو انھوں نے دوسری غیر مسلم اقوام کے زیر حکومت آجانے کے بعد اختیار کر لیا۔ بلکہ ضروری ہے کہ اوّل الذکر دور کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا جائے، زمانۂ عروج و استحکام جو پہلے دور کے نصف اوّل میں رہا اور اضمحلال اور زوال کا زمانہ جو مختلف علاقوں میں مختلف رہا، مگر دوسرے پانچ سو سالوں میں کہیں بھی وہ بات نہ رہی جو شروع کے پانچ سو سالوں میں تھی۔ چوتھی صدی ہجری تک آزادی فکر اور علمی ترقی اپنے انتہائی

عروج پر تھی جس کے بیان سے لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔ اس کے بعد سیاسی اختلافات اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ایسا لگتا ہے کہ عوام کو انتشار فکر وعمل سے بچانے کے خیال سے ہر ایک کو کسی فقہی مذہب سے وابستگی کا مشورہ دیا جانے لگا، کلامی بحثوں کے لاطائل سلسلہ پر بند باندھنے میں عافیّت سمجھی گئی اور اس خوداعتمادی کی جگہ جس نے عروج کے زمانے میں سارے جہاں کی حکمتیں سمیٹنے اور انھیں اسلامی جامہ پہنانے کی ہمّت دی تھی، انجانے کے خوف اور ہر نئی بات کی طرف سے اندیشہ نے لے لی۔ ادھر یہ کیفیّت جڑ پکڑ رہی تھی ادھر استعمار کی یلغار نے پوری امّت کو دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں اسپین سے نکالے جانے اور اس کے دو سو سال بعد مغل اور عثمانی زوال کا آغاز، اٹھارویں، انّیسویں صدیوں میں پوری دنیائے اسلام پر استعماری تسلّط اور مسلمانوں کی فکری فضا میں عیسائی مشنریوں کے مچائے ہوئے شور وغوغا کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہی زمانہ تھا جب یورپ میں صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں زمانہ آگے بڑھنے کے ساتھ رونما ہونے والی مذکورہ بالا تبدیلیاں نئے سوالات اٹھا رہی تھیں مگر امّت کا اندرونی فکری ماحول بدل چکا تھا، تقلید جامد کو اضمحلال و انحطاط سے بچانے کا واحد طریقہ سمجھا گیا جو آواز کسی نئے گوشے سے اٹھی اس پر دشمن کے ایجنٹ ہونے کا گمان ہوا، کسی شامت کے مارے نے اگر یہ کہہ دیا کہ دشمنوں کے پاس کچھ ایسا بھی ہے جو سیکھنے کے لائق ہے تو اسے خارج از ملّت قرار دیا گیا۔

بیسویں صدی کے وسط میں یکے بعد دیگرے سارے مسلمان اکثریت والے علاقوں کی آزاد مملکتیں قائم ہونے کے بعد صورت حال تیزی سے بدلنے لگی۔ مگر صورت حال میں ان خوش آئند تبدیلیوں کا ذکر بعد میں، ابھی ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے جو اوپر کیا گیا: امّت زمانہ آگے بڑھنے کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں سے کماحقہ کیوں نہ نمٹ سکی؟ جیسا کی اوپر کی سطروں میں بتایا گیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب تیز رفتار تبدیلیوں کا سیلاب آیا تو مسلمان معاشرہ اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کے اسباب کی بنا پر خود اعتمادی سے محروم، اندیشوں سے لبریز اور خوفِ شکست و ریخت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اپنے ماضی کے سرمایوں کو بچانے کی خاطر اس نے مستقبل کی دنیا کی لگام کو دوسروں کے ہاتھوں میں جانے دیا مگر اس کی ہمّت نہ کرسکا کہ ایک نئے اسلامی مستقبل کی تعمیر کے لیے ماضی پر تنقیدی نظر ڈالے، تقلید کی مانوس راہوں کو چھوڑ کر انجانے راستوں پر قدم رکھنے کی جرأت کرے اور اپنے دور اوّل کی طرح دنیا بھر سے مفید مطلب چیزوں کو سیکھتا ہوا آگے بڑھے۔ اب ان تاریخی اسباب کا ماتم کرنے یا ان کا تدارک نہ کر سکنے پر دوسروں یا اپنوں کو مطعون کرنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے یہ سوچنا چاہیئے کہ اس صورت حال کو بدلا کیسے جائے۔

تلافیٔ مافات کا آغاز

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس بات کا احساس عام ہو چکا ہے کہ زمانہ جو تبدیلیاں ساتھ لایا ہے ان سے نمٹنے کے لیے کچھ کرنا ہے۔ اس فکری تبدیلی کا آغاز ہوئے دو صدیاں گزر گئیں، ان پر کافی گفتگو بھی کی جاتی رہی ہے۔ ان باتوں کو دہرانے کی بجائے آگے کی بات کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اپنے حالات کے مطابق ایک فعاّل فکری ماحول کی تعمیر میں حصّہ لینے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ خواندگی، تعلیم، صحّت، مالی حالت، فکر عالم، ربط باہم، انکسار و تواضع، سب کے ساتھ تعاون، سب کے لیے اپنے ہی جیسے مقام و احترام کا اعتراف، اس اصول کو مان کر آگے بڑھنا کسی فرد یا گروہ کو کسی دوسرے فرد یا گروہ پر تسلّط جمانے کا حق نہیں۔ یہ آداب دوسروں سے تعلّقات میں برتنے سے پہلے مسلمانوں کو خود آپس میں برتنے ہوں گے۔ اس کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ نئے پیش آمدہ اجتماعی مسائل میں فیصلہ (یا فتویٰ دینے) کا مجاز صرف اپنے گروہ یا اپنے حلقہ کے علماء و فقہاء کو سمجھنے کی بجائے ان مسائل میں فیصلہ کا اسلامی طریقہ اختیار کریں۔

شورائی طریق فیصلہ

اسلام نے یہ سکھایا ہے کہ اجتماعی امور میں فیصلہ باہم مشورہ سے کیا جائے۔ قرآن کریم کے مطابق مسلمان وہ ہیں جو:

﴿والّذین استجابوا لربّھم و اقاموا الصلوٰۃ و امرھم شوریٰ بینھم﴾(۳)

جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں......

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بھی مشاورت کے بعد فیصلہ کرنے کی تلقین کی:

﴿و شاورھم فی الامر، فاذا عزمت فتوکّل علی اللہ﴾(۴)

اور معاملات میں ان سے مشورہ کرو، اور جب (کسی کام کا) تہیّہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

باہم مشورہ سے فیصلہ کرنے کا یہ طریقہ سارے ان امور میں مطلوب ہے جن سے کئی لوگوں کا مفاد وابستہ ہو، مثلاً خاندانی امور:

﴿فان ارادا فصالاً عن تراضٍ منھما و تشاورٍ فلا جناح علیھما﴾(۵)

لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے بھی مشاورت کی تاکید فرمائی ہے:

سعید ابن مسیّب نے علیؓ سے روایت کی ہے، کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا، اے اللہ کے رسولؐ، کبھی ہمارے سامنے کوئی ایسا معاملہ آ جاتا ہے جس کے بارے میں نہ تو قرآن نازل ہوا نہ آپ کی طرف سے کوئی سنّت قائم ہوئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس معاملہ (میں فیصلہ) کے لیے مسلمانوں میں سے عالم لوگوں (یا فرمایا، عبادت گزار لوگوں) کو بلاؤ اور مشورے سے طے کرو، کسی ایک کی رائے پر فیصلہ کا مدار نہ ہو۔(٦)

ساتھ ہی آپ ﷺ نے یہ بھی جتا دیا کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے اس کی بڑی ذمہ داری ہے:

جابرؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے مشورہ طلب کرے تو اسے مشورہ ضرور دینا چاہیے۔(۷)

ابوھریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس سے مشورہ کیا جائے تو وہ امانت کا ذمّہ دار ہے۔(۸)

اسوۂ نبویؐ

نبی ﷺ خود ہر اجتماعی معاملہ میں مشورہ سے فیصلہ کرتے تھے:

ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے تم لوگوں میں کسی کو اپنے ساتھیوں سے اس قدر مشورے کرتے نہیں دیکھا جس قدر کہ رسول اللہؐ کرتے تھے۔(۹)

آپ ﷺ کے مشوروں کا تاریخی ریکارڈ بہت طویل ہے، یہاں نہ تو اس کا احاطہ ممکن ہے نہ ہمارے موضوع کا تقاضا ہے کہ ایسا کیا جائے۔ ذیل میں جو مثالیں نقل کی جا رہی ہیں ان سب کا تعلّق اختلافی امور سے ہے۔ ہمارے موضوع کی نسبت سے اہم بات یہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی معاملہ ایسا در پیش ہوا جس میں لوگوں کی رائیں مختلف تھیں تو اس پر آپؐ نے تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ کیا۔

جنگ بدر کے موقع پر سب سے مشورہ ہوا پھر آگے بڑھ کر قریش کو مزاحمت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔(۱۰)

پھر جب کچھ لوگ قیدی بنا کر مدینہ لائے گئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ مشاورت ہوئی جس میں بڑا اختلاف ہوا، مگر جس نے جو رائے دی دلیل کے ساتھ دی۔ چوں کہ بعد میں وحی بھی نازل ہوئی اس لیے اس بحث کی پوری تفصیل کا مطالعہ سورۂ انفال، آیات ۶۷-۶۹ کی تفسیر اور سیرت کی کتابوں، خاص طور پر سیرت ابن ھشام کی مدد سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ ایک تاریخ ساز مشاورت وہ ہے جو جنگ احد کے موقع پر ہوئی کہ لڑائی کے لیے مدینہ سے باہر نکلنا چاہیے یا شہر کے اندر رہ کر لڑنا بہتر ہو گا۔ سورۂ اٰل عمران آیت ۱۵۹ کا تعلّق اسی مشاورت اور فیصلہ سے ہے۔ ہمارے موضوع، اختلافی اجتماعی امور میں فیصلہ کا طریقہ، کی نسبت سے اس نظیر کی بڑی اہمیّت ہے۔ سیّد قطب نے اپنی تفسیر، فی ظلال القرآن، میں مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں اس پر بصیرت افروز بحث کی ہے، اس موضوع پر ابن ھشام اور ابن قیم کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔(۱۱) اسی طرح جنگ خندق اور خیبر کے مواقع پر مشاورت اور فیصلہ کی رپورٹوں پر نظر ڈالنا مفید رہے گا۔ اسی طرح قبیلہ غطفان سے صلح کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں جو اختلاف ہوا اور جس بحث کے بعد فیصلہ کیا گیا وہ بھی سبق آموز ہے۔(۱۲)

خلفاء راشدین کے نظائر

حضرت ابوبکرؓ کے اہم فیصلوں میں سے جو تبادلۂ خیال، اختلاف، بحث اور مشورے کے بعد کیے گئے مانعینِ زکاۃ سے جنگ اور جمع قرآن نیز اہل روم سے لڑائی کے لئے فوج بھیجنا شامل ہے۔ ان کا مطالعہ تاریخی مراجع کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔(۱۳)

حضرت عمرؓ کا عہد خلافت زیادہ طویل تھا اس لیے اختلافی امور میں بحث و نظر کے بعد فیصلہ کی نظیریں بھی آپ کے عہد میں زیادہ ملتی ہیں۔ سب سے معرکۃ الآرا مثال عراق و شام کی مفتوحہ زمینوں کی ہے جس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔(۱۴) ذیل کے نظائر بھی سبق آموز ہیں۔

حارثہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا؛ شام کے کچھ لوگ عمرؓ کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا ہمارے نصیب میں کچھ مال، گھوڑے اور غلام آئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کچھ زکوٰۃ ہم سے لی جائے (یہ) پاک ہو جائے۔ (حضرت عمرؓ نے) فرمایا میرے دونوں پیش روؤں نے ایسا نہیں کیا کہ میں ایسا کر سکوں۔ آپ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں سے مشورہ طلب کیا جن میں علیؓ بھی شامل تھے۔ علیؓ نے کہا اچھی تجویز ہے بشرطیکہ یہ مستقل ٹیکس نہ بن جائے جو آپ کے بعد بھی لوگوں سے وصول کیا جانے لگے۔(۱۵)

عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ عمر بن الخطّابؓ نے شام کا سفر کیا۔ جب وہ سرغ (نامی جگہ پر) پہنچے تو فوج کے امراء، ابو عبیدہؓ بن الجراح اور ان کے ساتھیوں نے ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے آپ کو بتایا کہ سرزمین شام میں (طاعون کی) وباء پھیل چکی ہے۔ ابن عبّاسؓ کہتے ہیں کہ عمر بن الخطّابؓ نے کہا مہاجرین اوّلین کو میرے پاس بلاؤ۔ چنانچہ وہ بلا لیے گئے۔ آپ نے ان سے مشورہ کیا کہ شام میں وباء پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی رائیں مختلف تھیں۔ بعض نے کہا آپ ایک کام سے نکلے ہیں، ہماری رائے تو یہی ہے کہ اسے چھوڑ کر واپس نہ جائیں۔ کچھ دوسرے لوگوں نے کہا، آپ کے ساتھ رسو ل اللہﷺ کے صحابی اور باقی (بزرگ) لوگ ہیں ہم نہیں چاہتے کہ آپ ان لوگوں کو اس وبا میں جھونک دیں۔ عمرؓ نے کہا آپ لوگ جائیے، پھر آپ نے کہا انصار کو میرے پاس بلاؤ تو میں نے انھیں بلوا لیا اور آپ نے ان سے بھی مشورہ کیا تو انھوں نے بھی وہی موقف اختیار کیا جو مہاجرین کا تھا اور ان کے درمیان بھی اختلاف ہوا جیسا مہاجرین کے درمیان ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا آپ لوگ جائیے، پھر کہا یہا ں جو قریش کے شیوخ ہوں جنھوں نے فتح (مکّہ) کے موقع پر ہجرت کی ہو ان کو بلاؤ۔ میں نے ایسے لوگوں کو بلا دیا، ان کے درمیان کوئی دو رائے نہیں تھی سب نے یہی کہا کہ ہماری رائے میں آپ (اپنے ساتھ آئے) لوگوں کے ساتھ واپس جائیں اور انھیں اس وبا کے حوالہ نہ کریں۔ (سب کی باتیں سننے کے بعد) عمرؓ نے اعلان عام کر دیا کہ صبح سویرے میں (واپسی کے لئے) اپنی سواری پر ہوں گا۔ چنانچہ (آپ کے ساتھ آئے) سب لوگ سوار ہو لیے۔ ابوعبیدہؓ بولے، کیا تقدیر الٰہی سے فرار اختیار کیا جا رہا ہے؟ عمرؓ نے جواب دیا، ابو عبیدہ، کاش یہ بات تمھارے سوا کسی اور نے کہی ہوتی! ہاں،ہم تقدیر الٰہی سے بھاگ کر تقدیر الٰہی کی طرف جارہے ہیں۔

مطالعہ کرنے والا بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ رائے دینے والے بے جھجھک بولتے تھے اور رائے ظاہر کرنے والوں کا دائرہ خاصہ وسیع تھا۔ ان فیصلوں کے پہلو بہ پہلو سیّد نا عمرؓ کا ایک کلیّۃً مختلف قسم کا فیصلہ اسلامی کیلنڈر کا آغاز ہجرت سے کرنے کا فیصلہ تھا جو عام صلاح و مشورہ کے بعد کیا گیا۔ ان چند جھلکیوں سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلامی سماج میں اظہار رائے کی آزادی اور تبادلۂ خیال کی رسم کتنی گہری تھی اور اختلافی امور میں فیصلہ کرنے میں اس سے کتنی مدد ملتی تھی۔

حضرت عثمانؓ کا تاریخ ساز فیصلہ قرآن کریم کے مستند نسخے تیار کرانا اور ہر علاقہ میں ان کی اشاعت ہے۔ یہ اقدام خاصے غور اور بحث و مباحثہ کے بعد عمل میں آیا۔(۱۶)

آپ کے دور حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس دور میں اختلافات کا بازار گرم رہا۔

اس مقالہ کے موضوع کی نسبت سے نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے کبھی زبان بندی کی کوشش نہیں کی۔ ہر عام و خاص کو اپنی رائے کے اظہار کی پوری آزادی تھی۔ نہ تو منبر وعظ سے جہنّم کا خوف دلا کر ان کی زباں بندی کی گئی نہ کسی کے پیچھے پولیس لگائی گئی۔ سب سے حساس معاملہ افسران حکومت کی تقرری کا تھا۔ نہ صرف عوام کو بلکہ اکابر صحابہؓ کو بعض تقرریوں سے اختلاف تھا۔ وہ خاموش نہیں رہے، مگر حضرت عثمانؓ نے ان کو ان وجوہ سے باخبر کیا جو ان کے فیصلہ کا سبب بنی تھیں۔ یہاں اس مسئلہ کی تنقیح ممکن ہے نہ مطلوب، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بنیادی آزادیوں کو سلب کرنے کا کسی کو خیال بھی نہیں آیا کیوں کہ اسلام میں انھیں سلب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ ہر اختلاف دور ہونا انسان کے مقدّر میں نہیں ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ رفع اختلاف کے اسلامی طریقوں پر کاربند رہیں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ جو حکمران یا مصلحین اس حد سے آگے بڑھ کر مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی خاطر اسلامی اصول و آداب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوسرے انسانوں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کرتے، آزادیٔ رائے اور اظہار خیال سے روکتے اورتبادلۂ خیالات پر قدغن لگاتے ہیں وہ اسلام پر ظلم کرتے ہیں۔ سیّدنا عثمانؓ کے عہد کے ان حالات کا مطالعہ مستند تاریخی مراجع کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔(۱۷)

چوتھے خلیفۂ راشد، سیّدنا علیؓ ابن ابی طالب کا دور بڑا مختصر اور پر آشوب رہا مگر اختلاف سے نبٹنے کے معاملہ میں آپ نے جو نظیر چھوڑی ہے وہ بہت اہم ہے۔ سب سے نازک مسئلہ خوارج کا تھا جو بزعم خود دینی بنیاد پر ایک انتہا پسندانہ موقف اختیار کیے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے درمیان اس بارے میں کہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے مختلف رائیں پائی جاتی تھیں مگر خلیفہ نے سمجھانے بجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور جس طریقہ پر آپ عمل پیرا رہے اس کی جھلک ذیل کے واقعہ میں دیکھی جا سکتی ہے:

ایک مرتبہ پانچ خارجی ان کے پاس گرفتار کر کے لائے گئے جو علی الاعلان ان کو گالیاں دے رہے تھے اور ان میں سے ایک برسرعام کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں علیؓ کو قتل کر دوں گا۔ مگر حضرت علیؓ نے ان سب کو چھوڑ دیا اور اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کی بد زبانی کا جواب تم چاہو تو بدزبانی سے دے لو، مگر جب تک وہ عملاً کوئی باغیانہ کاروائی نہیں کرتے، محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے۔(۱۸)

عہدخلافتِ راشدہ سے آگے بڑھنے سے پہلے اس نکتہ پر توجہ مرکوز کرنا مفید ہو گا کہ آزادانہ رائے

قائم کرنے والوں کے اظہارِ رائے اور ان کی آراء سے مشاورت کے ذریعہ استفادہ میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ نئے پیش آمدہ مسائل میں ایک اہم عنصر معلومات کا ہے۔ ایسے مسائل میں سابق تجربہ نہیں ہوتا جو رہنمائی کر سکے۔ قدرتی طور پر ایسی معلومات جن سے فیصلہ میں مدد مل سکے ہر فرد کو یکساں میسّر نہیں ہوتیں۔ آزادانہ رائے قائم کرنے والوں کے مشوروں کی روشنی میں کیے جانے والے فیصلے کا سماجی فائدہ یہ ہے کہ جو معلومات مختلف افراد کے پاس الگ الگ ہوں ان سے استفادہ کا موقع مل جاتا ہے۔ آج جب کہ معلومات کی اہمیّت پر بڑا علمی کام ہو چکا ہے یہ بات اہم نہیں لگتی مگر اس کا ادراک اسلاف کو بھی تھا۔ ابنِ قیّم نے حاکم کے لئے رعیّت سے مشاورت کے فائدے گناتے ہوئے 'ایسی مصلحت جاننے کے لیے جس سے واقفیّت ان میں سے صرف بعض لوگوں تک محدود ہو' کو بھی شمار کیا ہے۔(۱۹)

اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر وہ مؤمن کی ذمہ داری ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:
پس واجب یہ ہے کہ حق جاننے کی طلب ہو اور اس تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لازم کیا ہے کہ استطاعت کے مطابق اس کا تقویٰ اختیار کریں۔ اللہ کے تقویٰ کا مطلب ہے جو اس نے کرنے کو کہا اسے کیا جائے اور جس سے منع کیا اس سے دور رہا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ بندہ معلوم کرے کہ اس نے کیا کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ اسے بجا لائے اور کس بات سے روکا ہے تاکہ اس سے بچا رہے اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ کن باتوں کی اجازت ہے تاکہ (چاہے تو) انھیں کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ جاننا یک گونہ اجتہاد اور حق کی تلاش اور اندازہ کے بغیر ممکن نہیں۔(۲۰)

ظاہر ہے اس تلاش حق میں کامیابی ہر فردِ معاشرہ کے نصیب میں یکساں نہ ہو گی۔ مگر مشاورت پورے سماج کو ان تمام افراد کے نصیب سے فائدہ پہنچانے کا طریقہ ہے اور اسلام نے ہمیں اسی کی تعلیم دی ہے۔ ابن تیمیہ نے خوب لکھا ہے:

اب جسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف رہنمائی کی کہ حق اختیار کرے چاہے وہ جہاں بھی ملے اور جس کے پاس سے ملے...... تو ایسا آدمی سب سے بڑا عالم اور سب سے ٹھیک راستے پر قائم اور سب سے اچھے موقف کا حامل قرار پائے گا۔ ایسے لوگوں کے درمیان جب اختلاف واقع ہوتا ہے تو یہ اختلاف رحمت اور ہدایت ثابت ہوتا ہے، یہ لوگ ایک دوسرے کی تائید و حمایت کرتے ہیں اور ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ دراصل یہ اس تعاون اور باہم مل کر غور و فکر کرنے میں داخل ہے

جس سے انسان نہ اپنے دینی امور میں مستغنی ہو سکتے ہیں نہ دنیوی امور میں۔ (ان کے لئے ضروری ہے کہ) رائے قائم کریں، ایک دوسرے کی آراء کو جانیں اور ان پر غور کریں اور آپس میں مشورہ کریں اور سوچیں کہ صحیح فیصلہ تک پہنچنے کے لیے کیا اسباب و وسائل درکار ہوں گے۔ چنانچہ ہر ایک اپنے نتائج فکر سامنے لائے اور اس کی بصیرت نے جو روشنی عطا کی ہو اس کو پیش کرے۔(۲۱)

بڑی اہم بات کہی گئی کہ آزادانہ رائے قائم کرنا، اپنی رائے کا بے مہابہ اظہار اور تبادلۂ خیالات دراصل تقویٰ کا تقاضا ہے اور مشورہ کے ذریعہ اختلافات کا حل چاہنا اس تعاون باہمی کا تقاضا ہے جسے مومن کا طریق زندگی بتایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿المؤمنون والمؤمنٰت بعضھم اولیاء و بعض﴾(۲۲)

مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں۔

﴿و تعاونوا علی البرّ والتقویٰ﴾(۲۳)

اور بھلائی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔

مسلمانوں کی شروع کی نسلوں کو ان حقائق کا پورا شعور تھا کیوں کہ نبی ﷺ نے جن لوگوں کی تربیت کی تھی ان کے تربیت یافتہ لوگ اس فیض کو عام کرتے رہے۔ بعد میں سیاسی مصالح اور گروہی مفادات نیز قبائلی عصبیتوں کا اثر بڑھتا گیا اور بنیادی آزادیوں کو سلب کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو خوف اور طمع نے آزادئ فکر، بلا تکلف اظہار رائے، کھلے عام تبادلۂ آراء کے اسلامی طریقوں میں کمزوری کا مظاہرہ ہونے لگا۔ عوام کیا خواص کے لیے بھی سیاسی امور میں زبان کھولنا دشوار ہو گیا۔ سیاسی امور میں فیصلے اب مشاورت کی بجائے حکمراں مصاحبینِ خاص کی مدد سے کرنے لگے جن پر کھلے عام تنقید کی بھاری قیمت چکانی پڑتی۔ چنانچہ خلافت راشدہ کی جاری کردہ رسم رفتہ رفتہ بدل گئی اور ملوکیت نے اسلامی سماج کو اس کی اہم خصوصیت سے محروم کر دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کے اس مخصوص دائرہ میں جو آگے چل کر فقہ کہلایا ایسا نہیں ہوا۔ عبادات اور معاملات کے بیشتر مسائل میں آزادانہ اظہار رائے، تبادلۂ خیالات اور یک گونہ اجتماعی طریق فیصلہ رائج رہا۔ دوسری، تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں غور و فکر اور بحث و نظر کے متعدّد حلقے کوفہ، مدینہ بغداد، دمشق، قاہرہ وغیرہ شہروں میں نمودار ہوئے اور پھلے پھولے۔ ان کے بارے میں تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ فکر و نظر کے ساتھ اختلاف کا بازار بھی گرم رہا۔ بڑے بڑے بزرگان دین جن کی آج ہم یکساں عزت کرتے ہیں ایک دوسرے کی آراء سے اختلاف کرتے اور ان پر کھلے عام تنقید کرتے۔ نہ تو کوئی اس کا برا مانتا نہ اسے دبانے کی کوشش کرتا۔ یہی نہیں، مختلف مذاہب فقہ مختلف فیصلے کرتے اور ان پر

جمے رہتے مگر ایک دوسرے کو گمراہ نہ قرار دیتے۔ لوگوں کو اپنے خلوصِ نیّت پر اعتماد تھا اور اللہ پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ دلوں کے حال سے واقف ہے۔ اس کی جزا و سزا کا مدار صرف ظاہر پرنہیں۔

قاری کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہو گی کہ بڑے بڑے فقہاء ایک دوسرے سے نہ صرف علی الاعلان اختلاف کرتے رہے بلکہ اس اختلاف پر مبنی کتابیں بھی لکھتے رہے، مثال کے طور پر:

الردّ علی سیر الاوزاعی لابی یوسف یعقوب بن ابراھیم

الردّ علی ابی حنیفه لابی بکر بن ابی شیبه

الردّ علی محمّد بن الحسن الشیبانی للامام الشافعی

بات یہ ہے کہ اختلاف سے ڈرنا اسلامی سماج میں نسبتاً بعد کی پیداوار ہے اور اس کی کمزوری کی علامت ہے۔ قرن اول میں اسے ایک نارمل چیز سمجھا جاتا تھا، کیوں کہ خود نبیﷺ نے یہی سکھایا تھا:

عطاء ابن یسار ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: دو آدمی سفر کے لیے چلے، نماز کا وقت آ گیا اور ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمّم کیا اور نماز ادا کی۔ پھر وقت ختم ہونے سے پہلے ہی ان کو پانی دستیاب ہو گیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے وضوء کیا اور نماز دوبارہ پڑھی، مگر دوسرے نے نماز نہیں دہرائی۔ پھر دونوں رسو ل اللہﷺ کے پاس آئے تو ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ آپؐ نے ان سے جس نے نماز نہیں دہرائی تھی فرمایا: تم نے سنت کے مطابق کام کیا یعنی فرض شرعی پورا ہو گیا اور تمہاری نماز ادا ہو گئی۔ دوسرے آدمی سے جس نے وضوء کرکے نماز دہرائی، آپ نے فرمایا: تمھیں دوبار اجر ملے گا، یعنی حکم پر دوبار عمل کرنے کے عوض۔(۲۴)

اگر سیاسی اور سماجی امور میں اوپر سے کیے گئے فیصلے تھوپنے کا رواج ملوکیت کے ساتھ آیا تو روزمرہ معاملات اور فقہی مسائل میں زبان بندی، تقلید اور انفرادی آراء اور ان پر تبادلۂ خیال سے عوام کی محرومی بھی قرون اولیٰ کے طور طریقوں سے ایسا انحراف تھا جو وقتی، علاقائی اور گروہی مفادات ومصالح کی دین معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی رفتہ رفتہ آئی۔ گزشتہ پانچ سو سال میں اسلامی سماج کا جو حال رہا وہ اس سے پہلے کے پانچ سو سالوں میں آئی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ پہلے جابر اور زیادہ تر دین سے غافل اور بے بہرہ مسلمان حکمرانوں کی دخل اندازی سے بچانے کے لیے اجتہاد کا دروازہ بند کیا گیا پھر یوروپین اقوام کی سامراجی حکمرانی کے دور میں دفاعی اقدام کے طور پر نئی سوچ پر تالے لگے اور قدیم سے وابستگی اور وفاداری مدارِ دین داری قرار پائی۔ مگر بیسویں صدی

عیسوی-چودہویں صدی ہجری کے آتے آتے حالات بدلنے لگے۔ ایک طرف تو وہ قوتیں نہ رہیں یا مائل بہ زوال ہوئیں جن سے دفاع کے لیے عام غور وفکر اور تبادلۂ خیالات کے ذریعہ فیصلہ تک پہنچنے کی اصل اسلامی رِیت بدلی گئی تھی اور دوسری طرف نئے مسائل در پیش ہوئے، بلکہ نئے مسائل کا ایسا سیلاب آیا جس نے آخر کی صدیوں میں اختیار کی گئی روش پر قائم رہنا ناممکن بنا دیا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک مقالہ میں بتا چکے ہیں(۲۵) اسلامی سماج اب زوال کی صدیوں کے فکری جمود، سیاسی آمریت یا دینی چودہراہٹ پر مبنی طریق فیصلہ کے دلدل سے نکل کر اپنی اصل ڈگر کی طرف واپس آ رہا ہے۔ یہ عمل کم سے کم سو سال سے جاری ہے۔ اب اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس بازیافت کی رفتار ان چیلنجوں کا ساتھ دے رہی ہے جن سے امت کو سامنا ہے؟ اگر نہیں تو اسلامی طریق فیصلہ کی بحالی کا عمل تیز تر کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

یہ مقالہ نگار اپنی بعض دوسری تحریروں میں اس موضوع پر کچھ روشنی ڈال چکا ہے(۲۶) یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ گزشتہ ایک سو سال کی نسبت آج مسلمانوں کی صورت حال میں جن نئے عوامل کو دخل ہے ان پر توجہ مرکوز کی جائے تا کہ سو سال سے جاری تدابیر کو دہراتے رہنے کی بجائے ایسے نئے اقدامات بھی کیے جا سکیں جن میں بدلتے حالات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔

خوش آئند حالات

ایک بات جس میں تیزی سے فرق آیا ہے وہ معلومات کی سہل الوصولی اور ذرائع ابلاغ کی ارزانی و فراوانی ہے۔ یہ ایک ایجابی تبدیلی ہے۔ اس نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ہر خاص و عام پیش آمدہ مسائل سے واقف ہو سکے، اس کے مالہٗ و ماعلیہ پر غور کر سکے اور اس پر بحث مباحثہ میں حصہ لے سکے۔

دوسری خوش آئند بات امت کی وسیع آغوش میں ایک ایسے اضافہ کی ہے جو اپنی فکری توانائی اور مادّی وسائل میں امت کے پرانے روایتی عناصر پر فوقیت رکھنے کے سبب نئے غور و فکر میں زیادہ حصّہ لے سکتا ہے۔ تقریباً دو کروڑ مسلمان یورپ، شمالی اور جنوبی امریکا اور آسٹریلیا میں رہتے ہیں۔ ان کے درمیان آج روایتی انداز میں پڑھے اور تربیت یافتہ علماء دین کی تعداد برائے نام ہے مگر ایسے دانشوروں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جن کی اسلام سے وابستگی اور وفاداری کسی دوسرے سے کم نہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد عربی داں لوگوں کی ہے نیز ان کے درمیان عام خواندگی کی شرح

تقریباً صد فی صد ہے۔ نئے پیش آمدہ مسائل جو پوری دنیاء اسلام میں زیر بحث ہیں ان میں سے اکثر سے ان کو روز مرہ واسطہ ہے۔ چوں کہ نئے غور وفکر میں مقاصدِشریعت سے آگاہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی بھر پور حصّہ لینا ہے اس لیے آئندہ اس عنصر کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔

تیسری بات یہ ہے کہ نئے مسائل میں وہ بھی شامل ہیں جن کا تعلق یورپ امریکا وغیرہ سے دنیاء اسلام کے تعلقات، صرف سیاسی، سماجی اور معاشی ہی نہیں دعوتی تعلقات سے بھی ہے۔ خیال یہی ہے کہ ایسے مسائل کا دائرہ بڑھتا جائے گا۔ امت کا نوخیز مغربی بازو مغرب سے مکالمہ اور مفاہمت میں مددگار ہو سکتا ہے۔ ان کے اس رول role کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ اس میں سیاسی اقتدار اور علاقائی مفادات اس طرح حائل نہ ہوسکیں گے جس طرح وہ مسلمان ملکوں کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔

ایک جاذب توجہ واقعہ مشرق سے آنے والی وہ روشنی ہے جواسلامی افق پر ابھرنے والے نئے ستاروں سے آنا شروع ہوئی ہے۔ ہماری مراد ملیشیا، انڈونیشیا وغیرہ جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک میں ہونے والی ذہنی اور عملی کاوشوں سے ہے۔ ابھی ان کا اظہار زیادہ تر اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں ہو رہا ہے، مگر ان کی تازگی اور ان کا نیا پن پورے عالم اسلامی پر اثر انداز ہو کر رہے گا۔

صدیوں کی بگڑی عادت کے سبب عالم اسلامی میں خصوصاً ان ممالک میں جو شورائی طریق فیصلہ، عوام کی شرکت سے انتظام و انصرام مملکت، اور اظہار رائے اور آزادیٔ اجتماع وغیرہ سے محروم ہیں، زندگی کے ہر دائرہ میں ضابطہ بندی کا زور ہے۔ چنانچہ نئے اجتہاد اور پیش آمدہ مسائل پر غور و فکر اور تبادلہ آراء کے ذریعہ فیصلوں تک پہنچنے کے عمل کو بھی وہ آزادی میسر نہیں ہے جو دوسری تا چوتھی صدی ہجری میں میسر تھی۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ ضابطہ بندیوں میں ہمیشہ پھیلاؤ کا رجحان پایا جاتا ہے اور یہ کہ نئی فکر نئے حل اور نئی راہیں نکالنے کے عمل کو قید و بند راس نہیں آتی۔ ہمیں اس ماڈل پر بھروسہ کرنا ہو گا جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پایا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افراد کو آزادانہ سوچنے اور تبادلہ خیالات کی دعوت دینے میں کچھ خطر risk مضمر ہے۔ اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے خیالات سامنے آئیں گے، ان پر بحث مباحثہ میں بڑا وقت لگے گا، اہل علم کا بڑا وقت ضائع ہو گا کیوں کہ گمانِ غالب یہی ہے کہ ان نئے افکار میں سے اکثر غلط اور لاحاصل ثابت ہوں گے۔ کچھ لوگ سوچ سکتے ہیں کہ وہ صورتِ حال اس سے بہتر ہے جو صدیوں سے قائم چلی آ رہی ہے، یعنی نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی کوشش کو امت کے علماء اور فقہاء کا کام قرار دیا جائے اور باقی

لوگوں کو اس بات پر قانع رکھا جائے کہ ان کا کام سمع و طاعت ہے۔

یہ سوچ درست نہیں۔ اس کی پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کو ایک ایسے عمل میں شرکت سے محروم کرنا چاہتی ہے جس میں حصہ لینا ان کا صرف حق نہیں بلکہ ان کی ذمہ داری ہے، جیسا کہ اوپر دیئے گئے اقتباسات سے ظاہر ہے۔ دوسری غلطی یہ امید رکھنا ہے کہ جمہور امت کی فعال شرکت کے بغیر دینی درس گاہوں سے فارغ علماء اور فقہاء مسائل زمانہ سے نمٹ سکیں گے۔ رہا یہ تجربہ کہ علماء اور فقہاء کو حسبِ ضرورت جدید علوم کے ماہرین کی رائیں سننے کا موقع ملتا رہے تو کام چل سکتا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اس سے کام نہیں چل رہا ہے(۲۷)۔ اس طرز فکر کا تیسرا نقصان یہ ہے کہ اس سے متأثر ہو کر محتاط افراد تو پیچھے ہٹ جائیں گے مگر ان لوگوں کی اجتہادی کوششوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا جو موجودہ زمانہ کے علماء اور فقہاء کے کام سے مطمئن نہیں اور زمانہ کے دباؤ کے تحت نئی سوچ کے عمل میں کافی آگے جا چکے ہیں۔ اس غیر متوازن فضا سے وہ فضا زیادہ اچھی رہے گی جس میں دین دار و پرہیز گار لوگ بھی نئے اجتہادی عمل میں بھرپور حصّہ لیں۔ چوتھی غلطی مبالغہ آرائی ہے۔ ہم سو سال سے اس صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ امت کو اپنے افراد کی اجتہادی کوششوں سے کیا نقصان پہنچا؟ آخری اور اہم ترین بات یہ ہے جو قیمت ہمیں لا تعداد نئے افکار کو بحث و نظر کے بعد ردّ کرنے میں لگے وقت کی شکل میں ادا کرنی ہو گی اس کے عوض جو متاع بے بہا حاصل ہونے کی امید ہے اسے حاصل کرنے کا اس عمل تفکر و مناظرہ کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ دوسری سے چوتھی صدی تک جاری رہنے والے عمل، جس کے سہارے امت آج ہزار سال سے جی رہی ہے، اس عمل کی بھی یہی کیفیت تھی۔ جس خطر کا آج اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے وہ فی الواقع پیش آیا، مگر اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق مفید اور کارآمد کو بقاء و استمرار نصیب ہوا اور باقی افکار و آراء تاریخ کی نذر ہوئے:

﴿فامّا الزبد فیذھب جفاءً و امّا ما ینفع النّاس فیمکث فی الارض﴾(۲۸)

جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ سے سبق لیتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو نئے حالات میں نئی سوچ سے نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ نہ سوچنے اور حرکت میں نہ آنے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان فرد، مرد اور عورت، مسلمان گھرانے، محلّے، مسجدیں، مدرسے، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، مسلمانوں کی دینی، سیاسی یا سماجی تنظیموں سب کی فضا غور و فکر، بحث اور جرح

و تنقید، اختلاف اور ردّو کدّ، اور فی الجملہ نئی سوچ کی ہمت افزائی نہیں کرتی بلکہ اس سے ڈرتی ہے، اس کو دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ بسا اوقات ہمارے بزرگ اپنی اس روش کے لیے ماضی کے کچھ ایسے مقولات اور اقدامات کا حوالہ دیتے ہیں جو مخصوص حالات اور محدود وقت کے لیے تھے۔ اب نہ وہ حالات رہے نہ وہ زمانہ۔ ضروری ہے کہ ہم خود اپنے حالات کا تجزیہ کریں، اپنے زمانہ کو سمجھیں اور ہدایاتِ الٰہی اور اسوۂ نبویؐ کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل خود متعین کریں۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اَڑنا   منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

خلاصۂ کلام

جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں ان میں مقاصدِ شریعت کے فہم و تطبیق میں اختلاف ہونا ایک نارمل بات ہے، اس پر تشویش کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت حال نادر نہیں، پہلے بھی ایسا ہوا اور آئندہ بھی ایسا ہو گا۔ اسلام نے ہمیں اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ بتایا ہے۔ پہلا قدم یہ ہے کہ ہدایت الٰہی سے ہر مسلمان مرد اور عورت کا بلا واسطہ رشتہ بحال کیا جائے۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ ہر فرد یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اسلام کا تقاضا کیا ہے، خدا کی مرضی کس میں ہے۔ تیسرا قدم یہ ہے کہ جو اس کی سمجھ میں آئے اس کو دوسروں کے سامنے بھی رکھے، ان کی رائے لے، اس پر غور کرے اس کے بارے میں رائے ظاہر کرے۔ اس عام غور و فکر کو رسمی اور غیر رسمی مجالس اور اداروں سے بھی گزرنا ہو گا۔ اس میں ویب پر بھی مذاکرے ہوں گے اور مساجد میں بھی منبر سے ان پر اظہارِ خیال کیا جائے گا۔ ان باتوں کا چرچا گھروں میں بھی ہو گا اور بازاروں میں بھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ آراء میں تقارب اور ارتکاز نمودار ہو گا۔ ایسے اجتماعی امور جن میں ایک ملک میں ایک ہی فیصلہ ممکن ہے، ان میں شورائی طریقِ فیصلہ سے لائقِ نفاذ حکم تک پہنچا جا سکے گا۔ جن افراد کی رائے فیصلہ سے مختلف رہی ہو گی انھیں بھی اس کی پابندی میں تردّد نہ ہو گا کیوں کہ وہ جانتے ہوں گے کہ وہ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرانے کی کوشش جاری رکھ سکتے ہیں۔ رہے انفرادی مسائل جن میں مختلف افراد کے مختلف مسلک اختیار کرنے میں نہ کوئی اشکال ہے نہ مضرّت، تو پہلے کی طرح لوگ آزاد ہوں گے اور رفتہ رفتہ ان کا عمل چند راہیں منتخب کر لے گا۔ انفرادی اور ملکی سطح کے علاوہ دوسری سطحیں بھی ہیں جن پر فیصلے ہو رہے ہیں۔ ماحولیاتی تلوث اور global warming جیسے مسائل عالمی سطح پر فیصلہ چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض مسائل علاقائی سطح پر اور بعض مقامی آبادیوں کی سطح پر مفاہمت کے طالب ہو سکتے ہیں۔ اصولی بات یہ ہے کہ جس فیصلہ سے جن لوگوں کے مفادات

و مصالح وابستہ ہوں ان پر کسی فیصلہ تک پہنچنے کے عمل میں ان سب کو، بالواسطہ یا بلا واسطہ، شرکت کا موقع ملنا چاہیے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اکثر مسائل میں متعلقہ مقصدِشریعت کی پہچان، کلّی اور اصولی سطح پر، آسان ہوتی ہے۔ ہر خاص و عام اسے سمجھ سکتا ہے۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب کہ مقاصدِ شریعت کے ممکنہ طریق حصول کے نتائج اور عواقب جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی مرحلہ ہے جس میں ماہرین فن، سائنسی اور سماجی علوم پر عبور رکھنے والے علماء اور صنعت و تجارت نیز بزنس مینجمنٹ اور پبلک ایڈمنسٹریشن وغیرہ کا تجربہ رکھنے والوں کی فعال شرکت کے بغیر صحیح نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ چوں کہ ان تمام امور کا تعلق نئے عوامل اور ان کے مستقبل میں پیش آ سکنے والے اثرات سے ہے اس لیے ماضی کا فقہی لٹریچر زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ آئندہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ فی الحال ایسے مسائل کے بارے میں کیا ہو رہا ہے، کیا آراء سامنے آ رہی ہیں، رائے دینے والے کون ہیں اور اگر کسی سطح پر کوئی فیصلے کیے گئے تو ان فیصلوں تک پہنچنے کا طریقہ کیا رہا، ان کی قبولیت کا درجہ کیا رہا، وغیرہ۔

امید ہے کہ اس مطالعہ کے نتیجہ میں ہم مقاصدِشریعت کی روشنی میں حکمِ شرعی تک پہنچنے کے عمل کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ ہو: مقاصد شریعت کی پہچان اور تطبیق میں عقل و فطرت کا حصہ، فکر و نظر، اسلام آباد، جلد ۴۳، شمارہ ۴، ۲۰۰۶ء، صفحات۔ ہندوستان میں یہ مقالہ بحث و نظر، دہلی اور ترجمان دارالعلوم، دہلی میں شائع ہوا ہے۔

۲۔ ایسی مثالیں خود نبی ﷺ کے عہد مبارک میں ملتی ہیں۔ شروع میں آپ نے فرمایا تھا کہ قربانی کا گوشت ذخیرہ نہ کیا جائے، بلکہ ایّام تشریق میں ہی خود کھا کر اور دوسروں میں تقسیم کرکے ختم کردیا جائے، بعد میں آپ نے ذخیرہ کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت عمرؓ نے مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ میں سے مال دینا بند کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے ضروری قرار دیا کہ کوئی کسی کا گم شدہ اونٹ پائے تو اسے لا کر حوالہ کرے، چھوڑ نہ دے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا۔

۳۔ القرآن، الشوریٰ، ۳۸

۴۔ القرآن، اٰل عمران، ۵۹

۵۔ القرآن، البقرہ، ۲۳۳

۶۔ دارمی: مسند۔کتاب المقدّمہ۔ بحوالہ لیزر ڈسک، موسوعۃ الحدیث الشریف، صفحہ۔۱۹۹۷

۷۔ ابن ماجہ، سنن۔حدیث نمبر ۳۷۴۲، کتاب الادب، باب المستشار مؤتمن

۸۔ ابن ماجہ، سنن۔حدیث نمبر ۳۷۴۵۔ کتاب الادب، باب المستشار مؤتمن

۹۔ ترمذی، سنن۔ حدیث نمبر ۹۰۰۳۔ کتاب الجہاد عن رسول اللہ، باب ماجاء فی المشورہ

۱۰۔ مسند امام احمد؛ حدیث نمبر ۱۸۴۲۱؛ ۹۱۸۲۱۔ کتاب باقی مسند المکثرین۔ ملاحظہ ہو: (www.al-islam.com)

۱۱۔ ابن قیم: زاد المعاد، جلد ۳، صفحہ ۱۳۷-۱۸۰، فصل فی غزوۃ احد۔بحوالہ (www.al-islam.com) اور اسی ویب سائٹ پر، ابن هشام: سیرۃ النبی، جلد ۲ صفحہ ۳۶-۴۶ (مشاورۃ الرسول القوم فی الخروج او البقاء)

۱۲۔ ملاحظہ ہو سیرت ابن هشام، جلد ۲

۱۳۔ نیز ملاحظہ ہو، خالد اسماعیل نایف الحمدانی: الجذور التاریخیّه للشوری وتطبیقاتها فی عصر النبوّة والخلا فة الراشده. الدراسات الاسلامیّہ، اسلام آباد، جلد ۳۸، عدد ۲۔ اپریل-نومبر ۲۰۰۳،صفحات ۶۲-۶۴

اس موضوع پر مزید روشنی کے لیے ملاحظہ ہو، توفیق الشاوی: فقه الشوریٰ والا ستشاره. قاهره،دار الوفاء للطباعة والنشرو التوزیع. ۱۹۹۲

۱۴۔ اراضی عراق و شام کے بارے میں مشاورت کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں مل جائیں گی۔ نیز ملاحظہ ہو محمد نجات اللہ صدّیقی: اسلام کا نظام محاصل، ترجمہ کتاب الخراج۔ قاضی ابویوسف۔ کراچی، مکتبۂ چراغ راہ۔ لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۶۶۔ صفحات ۱۷۰-۱۶۹۔ اور محمد نجات اللہ صدّیقی، اسلام کا نظریہ ملکیت۔ باب ۱۱، ج۔دہلی مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز اور لاہور ،اسلامک پبلیکیشنز

۱۵۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر۸۷، کتاب مسند العشرۃ المبشرہ بالجنّۃ باب اوّل مسند عمر بن الخطّاب۔ بحوالہ موسوعۃ الحدیث الشریف۔صخر۔۱۹۹۷

۱۶۔ بخاری: صحیح، حدیث نمبر ۴۰۶۴۔ فضائل القرآن اور ترمذی: سنن، حدیث نمبر۹۲۰۳۔تفسیرالقرآن عن رسول اللہ، و من سورۃ التوبہ۔ بحوالہ (www.al-islam.com)۔

۱۷۔ ملاحظہ ہو، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی: خلافت و ملوکیّت، لاہور، ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۷۹ صفحہ ۱۰۹

۱۸۔ المبسوط للسرخسی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۲۵، مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۳۲۴ھ، بحوالۂ خلافت و ملوکیت، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور، ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۷۹، صفحہ ۱۰۲

۱۹۔ ابن قیم: زاد المعاد، جلد ۳ صفحہ ۲۰۳، بحوالہ لیزر ڈسک: مولّفات الشیخ وتلمیذہ، مرکز التراث لابحاث الحاسب الآلی۔ عمان۔۱۹۹۹ء

۲۰۔ ابن قیم: زاد المعاد، جلد ۲ صفحہ ۲۳۰، بحوالہ لیزر ڈسک: مولّفات الشیخ وتلمیذہ، مرکز التراث لابحاث الحاسب الآلی۔ عمان۔۱۹۹۹ء

۲۱۔ ابن تیمیّہ: الصوائق المرسلہ، جلد ۲، صفحات ۶۱۵-۱۷، بحوالہ لیزر ڈسک: مولّفات الشیخ وتلمیذہ، مرکزالتراث لابحاث الحاسب الآلی، عمان ۱۹۹۹ء

۲۲۔ القرآن، التوبۃ، ۱۷

۲۳۔ القرآن، المائدہ، ۲

۲۴۔ ابو داوٗد اور نسائی نے روایت کی۔ بحوالۂ نیل الاوطار۔ ہم نے یہ عبارت، اختلاف الفقہاء، مصنّفہ امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی، ایڈٹ کردہ محمد صغیر حسن معصومی۔ نشر کردہ معہد البحوث الاسلامیہ، اسلام آباد۔ ۱۷۹۱، جلد۱، صفحہ ۳ سے نقل کی ہے۔

۲۵۔ مقاصدِ شریعت اور معاصر اسلامی فکر، وقائع اور امکانات۔فکر ونظر، اسلام آباد، جلد ۴۳، شمارہ ۲، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵

۲۶۔ ملاحظہ ہو: اکّیسویں صدی میں اسلام، مسلمان اور تحریکِ اسلامی، نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۲۰۰۵؛ اسلام معاشیات اور ادب، خطوط کے آئینہ میں، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰، صفحات ۳۹۷۔۴۲۶ اور تحریکِ اسلامی عصرِ حاضر میں، دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۱۹۹۵

۲۷۔ یہ بحث طویل ہے، چند باتوں کے لیے ملاحظہ ہو www.siddiqi.com/mns پر

Shariah, Economics and the Progress of Islamic Finance: The Role of Shariah Experts

Concept paper presented at Pre-Forum Workshop on

Select Ethical and Methodological Issues in Shari`a -Compliant Finance

SEVENTH HARVARD FORUM ON ISLAMIC FINANCE

Harvard Law School

Cambridge, Massachusetts, USA

Friday 21 April 2006

۲۸۔ القرآن، الرعد، ۱۷